علامہ اقبال کا فلسفۂ بیخودی

مولانا عبدالسلام ندوی

ڈاکٹر علامہ اقبال سے پہلے خودی اور بے خودی میں باہم کوئی ربط و علاقہ نہ تھا، اس لیے دونوں نامکمل تھے۔ نٹشے کے یہاں ''انفرادی خود اختیاری کا اس قدر زور ہے کہ فرد کا رشتہ ملت اور کائنات سے نہایت غیر معین اور غیر مبہم سا رہ جاتا ہے۔'' لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ خودی نہایت ناقص ہے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس کے برعکس صوفیا انفرادی خودی کو خدا کی ذات میں بالکل فنا کر دینے کی تعلیم دیتے تھے اور اس غرض سے وہ انفرادی خودی کو قطرہ سے اور خدا کو دریا سے تشبیہ دیتے تھے، جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح قطرہ دریا سے مل کر بالکل فنا ہو جاتا ہے، اسی طرح انسان کو اپنی خودی خدا کی ذات میں فنا کر دینی چاہیے لیکن ڈاکٹر صاحب اس کی مخالفت کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر قطرہ دریا میں جا کر موتی نہ بنا اور بالکل فنا تو یہ سراسر اس کا نقصان ہے کہ اپنی گرہ کا مال بھی گیا اور کچھ حاصل بھی نہ ہوا:

ز خود گذشتۂ اے قطرۂ محال اندیش　　شدن بہ بحر و گہر بر نخاستن تنگ است

اس لیے وہ قطرہ کو ایک دریا میں جانے کی تعلیم دیتے ہیں جس میں ابھرنے اور ڈوبنے دونوں حالتوں میں خودی اور بھی نمایاں ہوتی ہے:

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر　　کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر　　مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

لیکن یہ دریا خدا کی ذات نہیں جیسا کہ صوفیا کا خیال ہے بلکہ قوم و ملت کا وجود ہے اور اسی دریا میں ڈوب کر افراد انسانی دریا کے اندرونی خزانہ سے مالا مال ہو سکتے ہیں:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر　　ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص　　کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا

اس بحر بیکنار میں ڈوب پر جب افراد اپنی خودی کا بالکل فنا کر دیتے ہیں تو وہ گوہر مقصود ہاتھ آ جاتا ہے جس کو قومی خودی کہتے ہیں:

مسلمانی غم دل در خریدن　　چو سیماب از تپ یاراں تپیدن
حضورِ ملت از خود در گذشتن　　دگر بانگِ انا الملت کشیدن

اسی بنا پر ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ:

خودی از بے خودی آید پدیدار

اور اب یہ قومی خودی اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ خدائی کا دعویٰ بھی اس کے لیے جائز ہو جاتا ہے:

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست　　سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ　　اگر قومے بگوید ناروا نیست

اسی بے خودی یا فردِ ملت کے باہمی ربط کو ڈاکٹر صاحب نے مختلف شاعرانہ تمثیلات سے سمجھایا ہے مثلاً:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ　　ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے　　کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور　　خالی ہے جیبِ گُلِ زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور　　رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو　　نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ　　پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے　　کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے
محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی　　عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی
اے شب کے پاسبانو! آئے آسماں کے تارو!　　تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمھاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے　　رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں　　شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمھاری

رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے　　وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

حسنِ ازل سے پیدا تاروں بھری فضا سے　　جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیزگام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
برگ سبزے کز نہالِ خویش ریخت
از بہاراں تارِ امیدش شکست
مردمان خوگر بیک دیگر شوند
سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
محفلِ انجم ز جذبِ باہم است
ہستیِ کوکب ز کوکب محکم است

انفرادی حالت میں خودی بالکل خودمختار، مطلق العنان اور سراپا غرور ہوتی ہے لیکن جماعت میں شامل ہوکر یہ تمام اخلاقِ رذیلہ بدل جاتے ہیں اور ان کے بجائے باہمی لطف ومحبت کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے:

جبر قطعِ اختیارش میکند
از محبت مایۂ دارش میکند
ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز
در جماعت خود شکن گردد خودی
تاز گلبرگے چمن گردد خودی

لیکن سوال یہ ہے کہ فرد و جماعت کے باہمی ربط کا وہ اصول جس سے عداوت کے بجائے محبت اور ناز کے بجائے نیاز پیدا ہو، کیا ہے؟ یورپ نے اس کے متعلق جو اصول قائم کیے تھے، وہ سب کے سب سیاسی، معاشی اور وطنی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے ان سے محبت کے بجائے عداوت اور نیاز پیدا ہوتا تھا۔ انقلابِ فرانس جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں شروع ہوا تھا، فرد کی آزادی کا علمبردار تھا، لیکن جب مشینی ترقی کے سیلاب نے دولت اور ذخائر دولت کو چند افراد کی ملکیت بنانا شروع کیا اور سرمایہ داروں نے شہنشاہیت کے ساتھ ساز باز کرکے پوری دنیا کو چند افراد کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تو فرد کی آزادی کے خلاف بغاوت شروع ہوئی اور اس بغاوت نے ایک طرف تو مارکس کی بین الاقوامی اشتراکیت کو پیدا کیا اور دوسری طرف میکیاولی کے قومی اتحاد کے تصور کو رفتہ رفتہ جرمنی کی قومی اشتراکیت (نیشنل سوشلزم) اور اٹلی کی فسطائیت (فاشزم) کے روپ میں جلوہ گر کیا، جس کا فرد کو جماعت پر قربان کردینا سب سے پہلا اصول ہے۔

غرض جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا دماغ غور وفکر کے مراحل طے کررہا تھا، یورپ میں فرد وملت

کی بحثیں شروع ہوگئی تھیں۔ اگر چہ اس مسئلہ کے متعلق اب تک مفکرین مختلف الرائے ہیں، تاہم اتنا طے ہو چکا ہے کہ فرد کو شترِ بے مہار کی طرح بالکل آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا، لیکن جہاں فسطائیت واشتراکیت میں فرد کی آزادی کو بالکل نظرانداز کر دینے پر اصرار کیا جاتا ہے وہاں جمہوریت میں فرد وملت کی آزادیوں کے درمیاں ایک قسم کی مفاہمت کرانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن بہرحال یہ تمام اصول سیاسی، معاشی اور وطنی ہیں اور دنیا میں اس وقت جو قیامت خیز ہنگامے برپا ہیں، ان سب کو انھی اصولوں نے پیدا کیا ہے اور اس بنا پر پیدا کیا ہے کہ ان کی بنیاد مادیت پر ہے، روحانیت پر نہیں ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفۂ بےخودی کی بنیاد روحانیت پر رکھ کر ان تمام جھگڑوں کو ختم کرنا چاہا ہے اور یہی وہ اصولی فرق ہے جو ان کے فلسفۂ فرد وملت کو یورپ کی جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور قومی اشتراکیت جیسے فلسفوں سے بالکل علیحدہ کر دیتا ہے اور افراد کا یہ روحانی ربط ایک ایسی ملت پیدا کر دیتا ہے جس کے حدود قوم ونسل رنگ ونسب یا وطن ومرز بوم کی رائج الوقت اصطلاحوں سے متعین نہیں ہوتے بلکہ روحانی افکار وخیالات سے اس کی حد بندی ہوتی ہے۔ اس لیے اجتماعیت اور انفرادیت کی جو کشمکش دولت وذخائر دولت کے محدود ہونے کی وجہ سے یورپ میں نظر آتی ہے، وہ ان کے فلسفہ میں نابود ہے۔

(عبدالسلام ندوی ــــ اقبال کامل)